شمارہ
۱۸

۱۶/جولائی تا ۳۱/جولائی ۲۰۲۶ء

پندرہ روزہ

آن لائن

اُردو گلبن (جدہ)

(خالص ادبی ومعاشرتی رسالہ)

ہم نے خوشبو کے بند کھول دیئے
اب ہوا تیری ذمہ داری ہے

مدیر اعلیٰ: مہتاب قدر

پندرہ روزہ

اُردو گلبن

(خالص ادبی و معاشرتی رسالہ)

مجلس ادارت

پروفیسر ارتضیٰ کریم

مہتاب قدر

مرزا محمد نواب

افسر حسین

اسلم افغانی

تاشقین سیّد

فیصل طفیل

مجلس مشاورت

نعیم جاوید	(دمام الخبر)
افتخار راغب	(ریاض)
محمد سیف الدین	(ریاض)
ناصر برنی	(ینبع)
محمد ہاشم علی	(حیدرآباد)
سراج وہاب	(جدہ)
افسر فہیم	(امریکہ)
دانش عبدالغفور	(ریاض)
مسعود حساس	(کویت)
عزیز الرب علیگ	(جدہ)
اعجاز شاہین	(امارات)

اشاعت کی شرائط

۱۔ مضمون زبان و بیان کے اعتبار سے مبہم اور پیچیدہ نہ ہو۔
۲۔ مضمون کا زیادہ تر مواد ماخوذ و مستفاد نہ ہو اور حوالے ساتھ نقل کیے جائیں۔
۳۔ مضمون میں موضوع سے متعلق کماحقہ احاطہ کیا گیا ہو۔
۴۔ اقتباسات/ اشعار ضرورت سے زیادہ نہ ہوں، مضمون نگار کی اپنی تحریر زیادہ ہو۔
۵۔ مضمون رسالہ کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو؛ یعنی تحریر سے کسی کی دل آزاری یا ہجو مقصود نہ ہو ۔
۶۔ مضمون میں ترجیحاً کوئی نیا زاویہ یا نئی جہت ہونی چاہیے۔
۷۔ مضمون نہایت مختصر یا بہت طویل نہ ہو۔
۸۔ مضمون نگار اپنی پاسپورٹ سائز تصویر، پورا پتہ، اور مراسلت کے لیے ای میل و فون نمبر بھی ارسال فرمائیں۔

مہتاب قدر
مدیر اعلیٰ
Email: mahtabqadr@gmail.com
Whatsapp: +966 50 132 9193

مرزا محمد نواب
Email: mirza_shanov@hotmail.com
Whatsapp: +966 50 8509457

تزئین کار محمد سلیمان طاہر

توجہ طلب: پندرہ روزہ آن لائن اُردو گلبن رسالے میں شائع ہونے والے تمام مضامین قلم کاروں کے اپنے ذاتی خیالات ہیں اور وہ خود ان کے ذمہ دار، کسی بھی تحریر سے کسی کی تضحیک یا ہجو منظور نہیں اور یہ مطلق ضروری نہیں کہ ادارہ اُردو گلبن قلم کاروں کی نگارشات سے اتفاق کرے۔

حُسنِ ترتیب

قرآنی آیت		4
حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)		4
اداریہ: ''اکتاہٹ اور تخلیقی رُجحان''	مہتاب قدر (جدہ)	5
سورۂ فاتحہ منظوم ''نام سے اے رب ہے تیرے ابتدا''	ریاض انور بلڈانوی	6
حمد باری تعالیٰ ''ہر گھڑی لب پہ ہے تیری حمد وثنا''	نصیر احمد عادل کھمرولی (بہار)	6
حمد باری تعالیٰ ''دن کو دن رات کو میں رات لکھوں''	مہتاب قدر (جدہ)	6
نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ''وہ آمنہ کا لال ہے''	ندیم ماہر (دوحہ۔قطر)	7

مضامین

شاعری کا باطنی سچ اور لفظوں کا فریب	علیم طاہر	8
کھیلوں کی دنیا: فیفا ورلڈ کپ (کھیل کا سب سے بڑا جشن)	سلیم خان (امریکا)	10
آپ بیتی: خرطوم سے دہلی تک	شکیل احمد (دہلی)	12
ظہیر عالم: عوامی احساسات وجذبات کے شاعر	ڈاکٹر اظہر حیات (ناگپور)	18
چنچل گوڑہ کی سیر	مہتاب قدر	09

غزلیں/نظم

''ایک احساں کہ ہمیں اپنا پرستار کیا''	تابش ردولوی (ایودھیا)	20
''گرمیوں کا موسم ہے، تتلیاں تڑپتی ہیں''	ڈاکٹر گوہر مسعود (فتحپور)	20
''امن کی فاختہ، پروں کے زخم''	سرفراز بزمی (راجستھان)	20
''لفظوں کی تعمیر کروں''	ڈاکٹر عائشہ سمن (ممبئی)	21
نظم ''کجی''	مقصود خاں علیگ	21

افسانہ

ذرا دھیرے چلو جی	اطہر اسلوبی (جدہ)	22

قلم قافلہ۔ادبی تعارف

کڈپہ کی گم نام اُردو مصنفہ	ستار فیضی کڈپوی	25
خالد سیف اللہ موتیہاری		25

تعارفِ کتب

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک از: مولانا ابوالحسن علی ندوی	(ادارہ)	26

آپ کے خطوط

خط ۱: تحقیقی رجحان	انیس احمد صدیقی (مہاراشٹرا)	27
خط ۲: خوب سے خوب تر	اطہر عباسی (جدہ)	27
خط ۳: بہترین رسالہ	شکیل احمد (دہلی)	27
خط ۴: قابل تعریف کاوش	پروفیسر ندیم زبیری (سعودی عرب)	28
خط ۵: عزت افزائی	سلیم خان (امریکا)	28
خط ۶: ادب۔ایک تہذیب وامانت	یاسمین اختر طوبیٰ	28

قرآنی آیت

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ
يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ
ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ...

بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی اللہ کی کتاب (یعنی نوشتۂ قدرت) میں بارہ مہینے (لکھی) ہے جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین (کے نظام) کو پیدا فرمایا تھا ان میں سے چار مہینے (رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) حرمت والے ہیں۔

(التوبة، 36:9)

حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَدِينَةَ،
فَرَأَى الْيَهُودَ تَصُومُ يَوْمَ عَاشُورَاءَ، فَقَالَ: مَا هَذَا قَالُوا: هَذَا يَوْمٌ صَالِحٌ،
هَذَا يَوْمٌ نَجَّى اللَّهُ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ عَدُوِّهِمْ، فَصَامَهُ مُوسَى. قَالَ:
فَأَنَا أَحَقُّ بِمُوسَى مِنْكُمْ «. فَصَامَهُ، وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ.

حضرت (عبداللہ) بن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ یہودی یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ پس ان سے اس کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون پر غلبہ و نصرت عطا فرمائی تو ہم اِس عظیم کامیابی کی تعظیم و تکریم بجالانے کے لیے اِس دن روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم تم سے زیادہ موسیٰ کے حق دار ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی) روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

شعر

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

ادار یہ

اکتاہٹ اور تخلیقی رجحان

انسانی زندگی میں اکتاہٹ ایک فطری کیفیت ہے۔ یہ کیفیت کبھی حالات کے جمود سے پیدا ہوتی ہے، کبھی یکسانیتِ عمل سے، اور کبھی داخلی تنہائی انسان کو اس موڑ پر لے آتی ہے جہاں ہر شے بے رنگ محسوس ہونے لگتی ہے۔ مگر یہی اکتاہٹ بعض اوقات تخلیقی رجحان کو جنم دیتی ہے۔ حساس ذہن جب معمول کی تکرار سے تھک جاتا ہے تو وہ نئے راستے تلاش کرنے لگتا ہے، اور یہی جستجو ادب، فن اور تخلیق کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

تخلیق کار عام انسان سے اس اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے معمولی تجربات میں بھی معنویت تلاش کرتا ہے۔ اکتاہٹ اُس کے لیے محض ذہنی بوجھ نہیں رہتی بلکہ وہ اسے اپنے اظہار کا وسیلہ بنالیتا ہے۔ شاعر اپنی بے چینی کو شعروں میں ڈھالتا ہے، افسانہ نگار کرداروں کے ذریعے اپنی داخلی کیفیت بیان کرتا ہے، جبکہ مصور رنگوں میں اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ گویا تخلیق دراصل انسانی باطن کی ایک پکار ہے۔

اُردو ادب میں کئی عظیم ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے پس منظر میں داخلی کرب اور اکتاہٹ کارفرما رہی ہے۔ میر تقی میر کی شاعری میں تنہائی اور اداسی کی جھلک نمایاں ہے، جبکہ غالب نے زندگی کے تضادات کو اپنے منفرد اسلوب میں بیان کیا۔ ان کے ہاں غم اور تخلیق ایک دُوسرے سے جدا نہیں دکھائی دیتے۔ یہی کیفیت جدید ادب میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے جہاں انسان کی داخلی شکست وریخت فن کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

اکتاہٹ اگرچہ ایک منفی احساس معلوم ہوتی ہے، لیکن یہی کیفیت انسان کو غور وفکر پر آمادہ کرتی ہے۔ جب ذہن بیرونی ہنگاموں سے اُکتا جاتا ہے تو وہ اپنے اندر کی دنیا میں جھانکنے لگتا ہے۔ اسی لمحے تخلیقی چراغ روشن ہوتے ہیں۔ نئے خیالات جنم لیتے ہیں، سوچ میں تازگی آتی ہے، اور انسان اپنے وجود کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگتا ہے۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا اور برق رفتار زندگی نے انسان کو مسلسل مصروف تو رکھا ہے، مگر ذہنی سکون کم کردیا ہے۔ اس مصنوعی مصروفیت کے باوجود انسان کے اندر ایک خلا موجود رہتا ہے۔ یہی خلا کبھی اکتاہٹ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اگر اس کیفیت کو مثبت انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مطالعہ، تحریر، مصوری، شاعری اور دیگر فنون انسان کو نہ صرف ذہنی آسودگی دیتے ہیں بلکہ اُس کی شخصیت میں نکھار بھی پیدا کرتے ہیں۔

مہتاب قدر
(جدّہ)

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اکتاہٹ کو محض بے کار احساس سمجھ کر نظر انداز نہ کریں بلکہ اسے اپنے باطن کی آواز سمجھیں۔ کیونکہ اکثر بڑے تخلیقی کارنامے اسی خاموش بے چینی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ تخلیق دراصل انسان کے اندر چھپی روشنی کا نام ہے، اور اکتاہٹ کبھی کبھی اسی روشنی تک پہنچنے کا راستہ بن جاتی ہے۔

حمد باری تعالیٰ

سورہ فاتحہ منظوم

ریاض انور بلڈانوی

نام سے اے رب ہے تیرے ابتدا
مہرباں ارحم ، تُو ہی سب سے بڑا

حمد تیری کل جہانوں کے خدا
رب تو ہی ہے مالک روز جزا

ہم عبادت تیری کرتے ہیں خدا
تجھ سے ہی امداد بھی چاہیں سدا

ہم کو سیدھا راستہ اے رب چلا
ان کا، جن پرخوب احساں ہے ترا

ہم کو گمراہوں کے رستے سے بچا
رب غضب جن پر ترا نازل ہوا

حمد باری تعالیٰ

نصیر احمد عادل کھرولی

(دربھنگہ بہار)

ہر گھڑی لب پہ ہے تیری حمد وثنا
تو ہے یکتا زمانے کا واحد خدا
سجدے کرتا رہوں تم کو ہر حال میں
چاہتا ہوں تری ساری جود و عطا
چاندسورج بھی طاعت ہیں کرتے تری
حکم پر گامزن سب ہیں رہتے سدا
ہے گلوں میں ترے دم سے سب رنگ وبو
تیری قدرت سے یارب ہے رنگ حنا
اپنی رحمت سے اشرف بنایا ہمیں
رکھ بنا کے زمین پہ تو اشرف سدا
دی کتابیں ہمیں روشنی کیلئے
ہے ہمارے لئے کم نہ احساں ترا
ہے کرم تیرا تو ہے زمیں آسماں
تونے رکھا تو ہے سانس کا سلسلہ
ناؤ دریا میں ہر پل چلاتا ہے تو
تیری قدرت کا ہر شئے میں ہے معجزہ
جس طرف دیکھو قدرت کا ہے شاہکار
آسمان و زمین آگ پانی ہوا
حمد ممکن نہیں کرسکے یہ بشر
یوں زمانے پہ احسان ہے آپ کا
میں خطا کار ہوں میں گنہگار ہوں
اپنی رحمت سے تو بخش دے یا خدا
اپنے سائے میں دے تو جگہ حشر میں
تیری بخشش کا عاصی کو ہے آسرا
زندگی دی تو دے بندگی کا شعور
یاد میں عمر گزرے یہ ہے التجا
پاک امراض سے زندگی رکھ مری
دے صحت ہم کو تو کاملہ عاجلہ
ہے دُعا بس یہ عادل کی تجھ سے فقط
خاتمہ میرا ایمان پر ہو خدا

حمد باری تعالیٰ

(بزمِ اُردو قطر کے طرحی حمدیہ مشاعرے کیلئے کہے گئے چند اشعار)

مہتاب قدر (جدہ)

دن کو دن رات کو میں رات لکھوں
تو جو چاہے وہی میں بات لکھوں

تیری قدرت کو غور سے دیکھوں
اور ذرّے کو کائنات لکھوں

جب بھی لکھوں کتاب دل اپنی
' صفحہ صفحہ تری صفات لکھوں'

اپنی مرضی سے جی چکا ہوں بہت
اب ترے نام یہ حیات لکھوں

شعر لکھوں میں اس طرح مولیٰ
ذکر تیرا ہو اپنی بات لکھوں

نعتِ رسولِ مقبول

ندیم ماہر
(دوحہ قطر)

وہ آمنہ کا لال ہے
وہ صاحب کمال ہے
سراپا اک جمال ہے
وہ اپنی ہی مثال ہے
کہ یوسفِ زماں ہے وہ
جمیل ہے جمال ہے
خلیق ہے مزاج میں
وہ کتنا خوش خصال ہے
وہ مقتدائے جن و انس
رفیق باکمال ہے
وہ دین حق کا پیشوا
وہ بدر ہے ہلال ہے
عرب سے اس کو عشق ہے
عجم سے اس کو پیار ہے
نبیِ آخر الزماں
شفیعِ یومِ آخرت
وہ مُصطفیٰ وہ مرتضیٰ
وہ مقتدائے باصفا
وہ شمس ہے، قمر ہے وہ
وہ آشنائے عرش ہے
وہ صاحب قرآن ہے
وہ صادق و امین ہے
بشر میں اولین ہے

وہ رحمتِ دو عالمین
وہ خاتم رسول ہے
وہ مخزنِ علوم ہے
وہ مبدءِ علوم ہے
وہ منتہائے معرفت
وہ منزلِ نصوص ہے
وہ لعلِ آبدار ہے
قرارِ قلب و جان ہے
علیمؔ ہے عفو ہے وہ
عزیزِ باصفا ہے وہ
وہ وجہ کائنات ہے
وہ زینتِ حیات ہے
وہ اک کھلی کتاب ہے
دو عالموں کا رہنما
بشیر ہے نذیرؔ ہے
بیاضِ روئے سحر ہے
وہ بے کسوں کا ہے ولی
حبیب و ہادیِ رسل
وہ حامد و مطیع ہے
حکیم ہے خطیب ہے
رفیق ہے حلیم ہے
نوشتہ خدا ہے وہ

وہ ختم مرسلین ہے
وہ فرش کا مکین ہے
مگر رسائی عرش تک
وہ گوہر محیط ہے
وہ مشک ہے وہ عود ہے
وہ عنبرِ حُسین ہے
وہ لعل سرگمین ہے
امامِ انبیاءِ ہے وہ
امامِ قبلتین ہے
امامِ متقین ہے
منہاجِ عارفین ہے
وہ حاوی علومِ سابقین ہے
مدثرِ و مزمل و
جامعِ اصول ہے
نبی بھی ہے رسول بھی
پیمبرِ عظیم ہے
چراغِ زندگی ہے وہ
خلاصۂ مدارکِ ظہورِ کائنات ہے
دلیل کعبۂ خدا، رسالتِ مآب ہے

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

شاعری کا باطنی سچ اور لفظوں کا فریب

تخلیقی صداقت کی جمالیاتی و نفسیاتی اہمیت

علیم طاہر

ادب کی تاریخ میں یہ سوال ہمیشہ سے زیرِ بحث رہا ہے کہ آخر وہ کون سی قوت ہے جو بعض شعری تخلیقات کو زمان و مکان کی حدود سے آزاد کر دیتی ہے، جبکہ بعض کلام اپنی اشاعت کے چند ہی دن بعد فراموشی کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ صرف فنی مہارت، عروضی پختگی یا لفظوں کی چمک دمک ہے؟ یا پھر شاعری کے اندر کوئی ایسی باطنی حقیقت بھی موجود ہوتی ہے جو اسے محض ایک ادبی متن کے بجائے انسانی روح کے تجربے میں تبدیل کر دیتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا اصل سرمایہ الفاظ نہیں بلکہ وہ احساس ہے جو الفاظ کے ذریعے منتقل ہوتا ہے۔ شعر کا حسن صرف اس کے بیان میں نہیں بلکہ اس جذبے کی سچائی میں پوشیدہ ہوتا ہے جس نے اسے جنم دیا ہو۔ جب شاعر اپنی ذات کے کسی حقیقی تجربے، مشاہدے یا داخلی کشمکش کو فن کی صورت عطا کرتا ہے تو اس کے الفاظ میں ایک ایسی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو براہِ راست قاری کے احساسات سے مخاطب ہوتی ہے۔ یہی تاثیر شاعری کو زندہ اور دیرپا بناتی ہے۔

اس کے برعکس ایسی شاعری جو محض تقلید، نمائش یا مصنوعی جذبات کے سہارے لکھی جائے، وقتی طور پر تو توجہ حاصل کر سکتی ہے مگر قاری کے وجدان میں کوئی مستقل مقام پیدا نہیں کر پاتی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی شعور محض معنی نہیں پڑھتا بلکہ معنی کے پس منظر میں موجود صداقت کو بھی محسوس کرتا ہے۔ لفظ جھوٹ بول سکتے ہیں، مگر احساسات کی دنیا میں جھوٹ زیادہ دیر قائم نہیں رہتا۔

نفسیات کے جدید مباحث اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں کہ انسان دوسروں کے تجربات سے جذباتی سطح پر وابستہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ادب، خصوصاً شاعری، اسی صلاحیت کو متحرک کرتی ہے۔ جب قاری کسی ایسے شعر سے گزرتا ہے جو کسی حقیقی دکھ، محبت، جدوجہد یا انکشاف کا آئینہ دار ہو تو وہ صرف اسے سمجھتا نہیں بلکہ اس کے ساتھ جذباتی طور پر شریک بھی ہو جاتا ہے۔ یوں شاعر اور قاری کے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم ہوتا ہے جو زمانے اور فاصلے کی حدوں سے ماورا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بڑے شعرا کی تخلیقات نسلوں تک زندہ رہتی ہیں۔ ان کے کلام میں انسانی تجربے کی وہ عالمگیریت موجود ہوتی ہے

جو ہر عہد کے انسان کو اپنے دکھ، اپنی امید اور اپنی تلاش کی جھلک دکھاتی ہے۔ عظیم شاعری انسان کو محض محظوظ نہیں کرتی بلکہ اس کی فکری اور جذباتی تشکیل میں بھی حصہ لیتی ہے۔ وہ زندگی کے پیچیدہ سوالات کا حتمی جواب نہیں دیتی، لیکن ان سوالات کو سمجھنے کا شعور ضرور عطا کرتی ہے۔

آج کے دور میں سوشل میڈیا اور فوری شہرت کے رجحان نے شاعری کے میدان کو بھی متاثر کیا ہے۔ بہت سے تخلیق کار مقبولیت کی دوڑ میں ایسے موضوعات اور اسالیب اختیار کرتے ہیں جو بظاہر دلکش ہوتے ہیں مگر ان کے پیچھے تجربے کی گہرائی موجود نہیں ہوتی۔ نتیجتاً ایسی تخلیقات تیزی سے مقبول تو ہو جاتی ہیں لیکن اسی تیزی سے فراموش بھی کر دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ شعر جو دل کی آگ سے پیدا ہوتا ہے، اپنی جگہ بنانے کے لیے کسی اشتہار یا مصنوعی تشہیر کا محتاج نہیں ہوتا۔

ادبی تنقید کا فریضہ

ادبی تنقید کا ایک اہم فریضہ بھی یہی ہے کہ وہ شاعری کو صرف فنی پیمانوں پر نہ پرکھے بلکہ اس کی داخلی صداقت، انسانی معنویت اور وجودی گہرائی کو بھی اہمیت دے۔ اگر تنقید محض لفظی صنعتوں اور فنی ترکیبوں تک محدود ہو جائے تو وہ شاعری کے اصل جوہر کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ تخلیق کی حقیقی قدر اس بات میں مضمر ہے کہ وہ انسانی شعور کو کس حد تک روشن کرتی ہے اور زندگی کو سمجھنے میں کس قدر معاون ثابت ہوتی ہے۔

شاعری دراصل انسان کے باطن کا سفر ہے۔ یہ سفر جتنا سچا ہوگا، اس کے اثرات اتنے ہی گہرے ہوں گے۔ مصنوعی جذبے وقتی تاثر پیدا کر سکتے ہیں مگر روح کو نہیں چھو سکتے۔ صرف وہی شعر دلوں میں گھر کرتا ہے جو خود کسی دل کی سچی دھڑکن سے پیدا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تاریخ میں زندہ رہنے والی تخلیقات وہی ہیں جن میں فن اور صداقت ایک دوسرے سے ہم آغوش نظر آتے ہیں۔

آخرکار یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کی اصل طاقت اس کے الفاظ کی آرائش میں نہیں بلکہ اس انسانی سچائی میں ہے جو ان الفاظ کے اندر سانس لیتی ہے۔ جب فن صداقت سے مل جاتا ہے تو شاعری محض ادب نہیں رہتی بلکہ شعور کی روشنی، احساس کی زبان اور انسان کی داخلی تربیت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ ایسی شاعری نہ صرف جمالیاتی لطف عطا کرتی ہے بلکہ انسان کو اپنے آپ سے ملانے کا کام بھی انجام دیتی ہے، اور یہی کسی بھی عظیم تخلیق کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

چنچل گوڑہ کی سیر

از: مہتاب قدر

"یہ محلہ بہت حسین تھا میاں میرا گھر بھی یہیں کہیں تھا میاں" انسان جب اپنے ماضی کی گلیوں میں لوٹتا ہے تو راستے صرف اینٹ اور پتھر کے نہیں ہوتے، ہر موڑ پر ایک یاد کھڑی ہوتی ہے، ہر دروازہ کسی چہرے کی پہچان بن جاتا ہے اور ہر گلی دل کی دھڑکن میں اتر آتی ہے۔ چنچل گوڑہ میرے لیے ایسا ہی ایک محلہ ہے، جہاں میری آنکھ نے دنیا دیکھی، جہاں بچپن نے دوڑنا سیکھا اور جہاں زندگی نے اپنی پہلی کہانیاں سنائیں۔ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن کے قدیم اور تاریخی محلوں میں شمار ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ قطب شاہی دور کے ایک مشہور ہاتھی "چنچل" کی چراگاہ اس علاقے میں تھی، اسی نسبت سے اس کا نام چنچل گوڑہ پڑ گیا۔

دکنی زبان میں "گوڑہ" بستی یا گاؤں کو کہتے ہیں، گویا یہ "چنچل کی بستی" تھی۔ اس کے گرد سعید آباد، ڈبیر پورہ، اعظم پورہ اور ملک پیٹ جیسے قدیم علاقے آباد ہیں، جن کی اپنی الگ تاریخ اور تہذیب ہے۔ مجھے آج بھی 1969ء کے آخری دنوں کا ایک منظر لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ میں شدید بخار میں مبتلا بستر پر پڑا تھا کہ اچانک باہر شور مچ گیا "پانی آیا... بھاگو!" معلوم ہوا کہ موسیٰ ندی کا پل ٹوٹ گیا ہے اور شہر میں سیلاب آ رہا ہے۔ لوگ گھروں سے یوں نکلے جیسے قیامت برپا ہوگئی ہو۔ کوئی سامان اٹھائے بھاگ رہا تھا، کوئی بچوں کو سنبھالے، کوئی بیماروں کو چادروں میں لپیٹے دوڑا جا رہا تھا۔ میرے ایک شگفتہ مزاج چچا نے اس ہنگامے میں سائیکل نکالی۔ کسی نے کہا: "کہاں جا رہے ہیں؟ پانی آ رہا ہے!" وہ مسکرا کر بولے: "وہی تو دیکھنے جا رہا ہوں کہ پانی کہاں تک آیا ہے!" کچھ دیر بعد ڈبیر پورہ اسٹیشن سے واپس آئے اور ہنستے ہوئے بولے: "دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں۔"

ادھر گھر میں ایک اور منظر تھا۔ والد صاحب تبلیغی جماعت کے ساتھ دہلی میوات گئے ہوئے تھے اور ایک چچا حج بیت اللہ کے سفر پر تھے۔ دادی اماں نے تینوں بہوؤں کو مصلوں پر بٹھا دیا۔ چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں تسبیح تھما دی گئی اور انہیں خاندان کے قدیم لکڑی کے تخت پر ذکرِ الٰہی کے لیے بٹھا دیا گیا۔ خوف کے عالم میں بھی ایمان کا یہ سکون

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

کھیلوں کی دنیا

سلیم خان

ہیوسٹن (ٹیکساس)، امریکا

فیفا ورلڈ کپ: کھیل کا سب سے بڑا جشن

دنیا میں کھیلوں کے بے شمار مقابلے منعقد ہوتے ہیں لیکن اگر کسی ایک ایونٹ (event) کو عالمی سطح پر سب سے زیادہ مقبولیت، توجہ اور جوش و خروش حاصل ہے تو وہ فیفا ورلڈ کپ (FIFA World Cup) ہے۔ یہ صرف ایک فٹ بال ٹورنامنٹ نہیں بلکہ ایک ایسا عالمی جشن ہے جس میں مختلف زبانوں، ثقافتوں، نسلوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی جذبے کے تحت متحد نظر آتے ہیں۔ ہر چار سال بعد منعقد ہونے والا یہ میلہ کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن جاتا ہے اور دنیا کے تقریباً ہر خطے میں اس کے چرچے سنائی دیتے ہیں۔

فیفا ورلڈ کپ کی تاریخ ایک صدی پر محیط ہے۔ اس دوران اس ایونٹ نے نہ صرف فٹ بال کے کھیل کو فروغ دیا بلکہ عالمی سطح پر باہمی تعلقات، ثقافتی تبادلوں اور کھیل دوستی کو بھی مضبوط کیا۔ جب مختلف ممالک کی ٹیمیں میدان میں اترتی ہیں تو وہ صرف گیارہ کھلاڑیوں پر مشتمل ایک ٹیم نہیں ہوتیں بلکہ اپنے پورے ملک کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گول، ہر فتح اور ہر شکست لاکھوں لوگوں کے جذبات سے جڑی ہوتی ہے۔

ورلڈ کپ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بڑے اور چھوٹے ممالک کے درمیان فرق کو مٹا دیتا ہے۔ کئی مرتبہ نسبتاً کمزور سمجھی جانے والی ٹیمیں طاقتور حریفوں کو شکست دے کر دنیا کو حیران کر دیتی ہیں۔ یہی غیر یقینی کیفیت اس کھیل کو مزید دلچسپ بناتی ہے۔ شائقین آخری لمحے تک نتائج کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے اور یہی عنصر ورلڈ کپ کی کشش میں اضافہ کرتا ہے۔

اس عالمی ایونٹ کا معاشی پہلو بھی نہایت اہم ہے۔ میزبان ممالک اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کرتے ہیں، نئے اسٹیڈیم تعمیر کیے جاتے ہیں، انفراسٹرکچر (infrastructure) کو بہتر بنایا جاتا ہے اور سیاحت کو فروغ ملتا ہے۔ لاکھوں غیر ملکی شائقین مختلف شہروں کا رخ کرتے ہیں جس سے مقامی کاروباروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ یوں ورلڈ کپ صرف کھیل تک محدود نہیں رہتا بلکہ معیشت، سیاحت اور ترقی کے مختلف شعبوں پر بھی مثبت اثرات مرتب کرتا ہے۔

سماجی اعتبار سے بھی فیفا ورلڈ کپ کی

اہمیت کم نہیں۔ یہ ایونٹ نوجوان نسل کو کھیلوں کی طرف راغب کرتا ہے اور صحت مند سرگرمیوں کو فروغ دیتا ہے۔ دنیا بھر کے بچے اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کو دیکھ کر بڑے خواب بُننا شروع کرتے ہیں۔ کئی نوجوان انہی عالمی ستاروں سے متاثر ہو کر فٹ بال کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح ورلڈ کپ نئی صلاحیتوں کے لیے تحریک کا ذریعہ بنتا ہے۔

میڈیا اور جدید ٹیکنالوجی نے ورلڈ کپ کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ آج ایک میچ بیک وقت دنیا کے مختلف ممالک میں دیکھا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا پر بحث و مباحثے، تجزیے اور تبصرے اس جوش کو کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا چند ہفتوں کے لیے ایک ہی موضوع پر گفتگو کر رہی ہے۔

تاہم ورلڈ کپ کی اصل خوبصورتی اس کے انسانی پہلو میں پوشیدہ ہے۔ میدان میں مقابلہ سخت ہوتا ہے لیکن میچ کے اختتام پر کھلاڑی ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے اور احترام کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ منظر اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ کھیل کا مقصد صرف جیتنا نہیں بلکہ باہمی احترام، برداشت اور بھائی چارے کو فروغ دینا بھی ہے۔

بلاشبہ فیفا ورلڈ کپ کھیلوں کی دنیا کا سب سے بڑا جشن ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب قومیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں، ثقافتیں ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں اور کروڑوں لوگ خوشی، امید اور جذبے کے تحت ایک مشترکہ احساس میں شریک ہوتے ہیں۔ فٹ بال کی ایک گیند دنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والے انسانوں کو جوڑ دیتی ہے، اور شاید یہی ورلڈ کپ کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

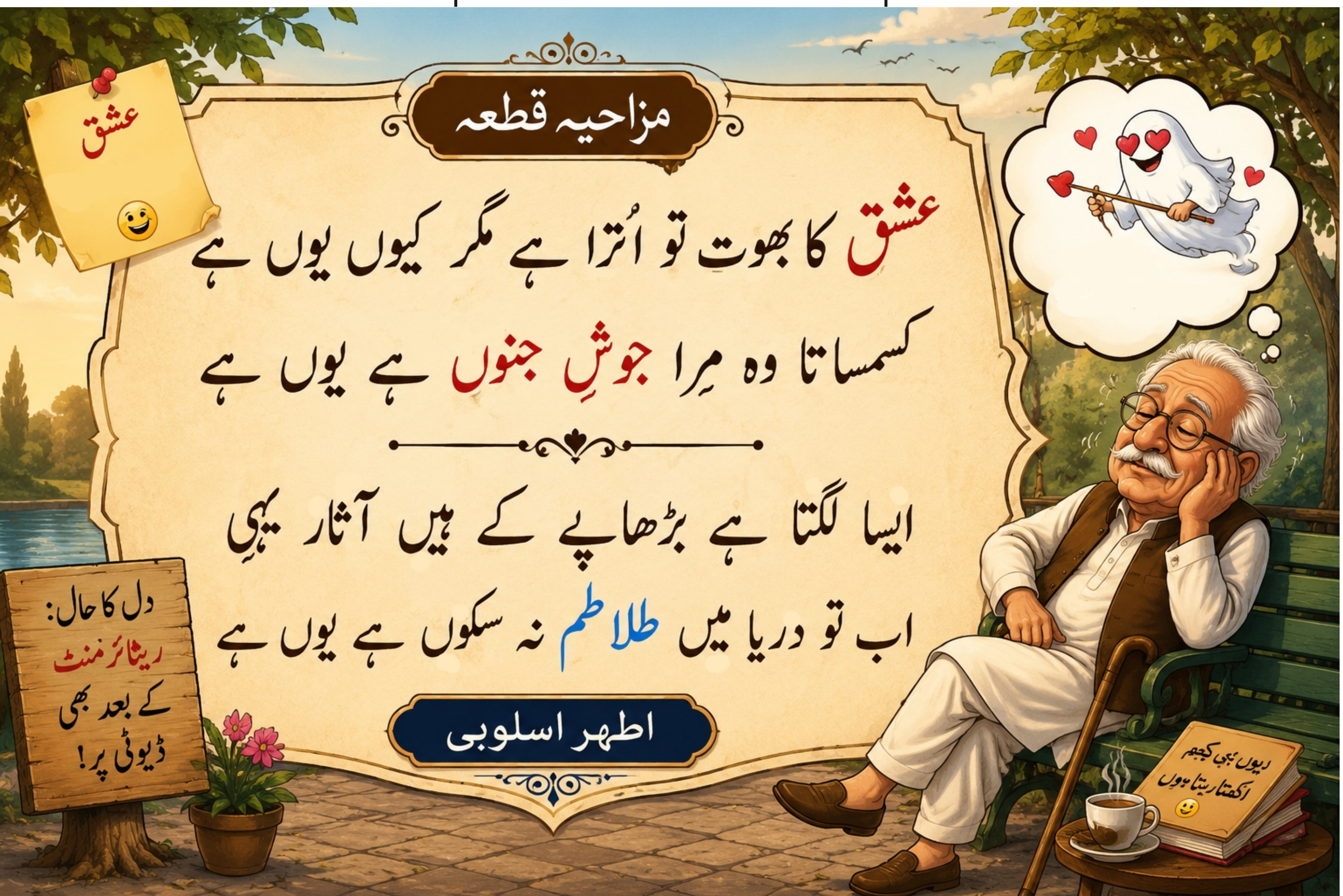

خرطوم سے دہلی تک

شکیل احمد (دہلی)

سوڈان کی راجدھانی خرطوم میں میرا قیام سوق عربي میں تھا جو ائرپورٹ سے تقریباً نو کلومیٹر دور تھا۔ خرطوم میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد 15 اپریل 2023 کی صبح 9 بجے خرطوم انٹرنیشنل ائرپورٹ جانے کے لیے میں ایک ٹیکسی پر سوار ہوا جو دریائے نیل کے کنارے کنارے، صدارتی محل سے ہوتی ہوئی اور مسلح افواج کی جنرل کمانڈ کے کمپاؤنڈ سے گزرتی ہوئی ائرپورٹ پہنچ گئی۔ Ethiopian فلائٹ سے مجھے دہلی واپس آنا تھا۔ ہفتہ کا دن تھا، رمضان المبارک کا 24 واں روزہ اور آخری عشرہ تھا۔ روڈ پر ٹریفک معمول کے مطابق تھا۔ البتہ ائرپورٹ کے اندر مسافروں کی گہما گہمی عام دنوں سے زیادہ تھی۔ کیوں کہ زیادہ تر لوگ سعودی عرب عمرہ کرنے یا دوسرے خلیجی ممالک اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ عید منانے جارہے تھے۔

سب کارروائی مکمل کرکے ساڑھے 10 بجے تک میں ائرپورٹ کے ویٹنگ ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں سے رن وے نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وجہ کیا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ آوازیں بڑھنے لگیں اور نزدیک سے نزدیک تر ہوتی گئیں۔ وہاں موجود مسافروں سے معلوم ہوا کہ سوڈان آرمی اور اس کے تحت پیرا ملٹری فورسز آر۔ایس۔ایف (Rapid Support Forces) کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہے اور آر۔ایس۔ایف نے ائرپورٹ اور رن وے پر قبضہ کرلیا ہے جس کے نتیجے میں ایک سعودی فلائٹ بھی متاثر ہوئی ہے۔ وہ مسافر جو فلائٹس میں بیٹھ چکے تھے اور اس کا عملہ، دونوں نے واپس ہال میں آنا شروع کردیا۔ اسی دوران ائرپورٹ کی سیکیورٹی کے عملے نے اندر آکر، حفاظت کے پیش نظر، اپنی وردیاں تبدیل کرنی شروع کردیں۔ جن کے پاس عام کپڑے نہیں تھے انھوں نے ڈیوٹی فری شاپ سے درخواست کرکے عام کپڑے لے کر پہن لیے۔

جب سے فائرنگ کی آوازیں آنی شروع ہوئی تھیں، ائرپورٹ کا مائک سسٹم خاموش تھا، لیکن مختلف افراد کے ذریعے یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوچکی تھی کہ تمام فلائٹس کینسل ہوچکی ہیں، کب شروع ہوں گی، واللہ اعلم بالصواب۔ سب مسافر اسی کشمکش میں تھے کہ کیا کریں، واپس اپنے اپنے گھر جائیں یا انتظار کرتے رہیں کہ شاید۔۔۔! تبھی ائرپورٹ کے ایک ذمے دار نے آکر سب مسافروں سے درخواست کی کہ جتنی جلدی ہوسکے ائرپورٹ سے نکل جائیں کیونکہ وہاں مزید رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ چارو ناچار، دوپہر 1 بجے کے بعد مسافروں نے اور مختلف جہازوں کے عملے نے باہر نکلنا شروع

کردیا۔ امیگریشن اور بیگ چیک ان کاؤنٹر تباہ ہوچکے تھے، ہر طرف ویرانی تھی۔ ائرپورٹ کا کوئی اسٹاف وہاں موجود نہ تھا۔ چیک ان بیگس یعنی وہ سامان جسے صبح جمع کرا چکے تھے، کہاں ہے اور کیسے ملے گا، کوئی بتانے والا نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے تک ائرپورٹ کا جو سسٹم قائم تھا وہ تہس نہس ہو چکا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ ائرپورٹ سے باہر نکلا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی اور ہندوستانی تنازع سے ملتی ہیں۔ اُس وقت حکومتِ سوڈان نے باغیوں کے خلاف کارروائی کے لیے مقامی مسلح گروہوں کی مدد لی، جنہیں عام طور پر جنجاوید ملیشیا (Janjaweed militia) کہا جاتا تھا۔ ان کے سربراہ جنرل محمد حمدان دقلو حمیدتی تھے۔ سنہ 2013 میں حمیدتی نے ایک نئی نیم فوجی تنظیم، ریپڈ سپورٹ فورسز (آر ایس ایف) کی سربراہی کے لیے سرکاری حیثیت حاصل کی۔ جنجاوید کو آر ایس ایف میں شامل کر درمیان اس موضوع پر تناؤ چل رہا تھا جس کا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں نکلا۔ جنگ شروع ہونے تک آر۔ایس۔ایف کی ذمہ داریوں میں اہم تنصیبات کی نگرانی کرنا تھی جن میں جنرل کمانڈ اور پریذیڈنٹ پیلیس بھی تھے۔

ائرپورٹ سے باہر آنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اصل لڑائی مسلح افواج کی جنرل کمانڈ کے اطراف میں ہو رہی ہے اس پر قبضہ کرنے کی غرض سے۔ جنرل کمانڈ ایک بہت بڑا کمپاؤنڈ تھا

1. خرطوم ایئرپورٹ جاتے ہوئے
دریائے نیل کے کنارے، صدارتی محل کے قریب

نظر نہیں آیا۔

ائرپورٹ سے باہر نکل کر جدھر نگاہ ڈالی، آر۔ایس۔ایف کے سینکڑوں جوانوں کو چاروں طرف بکھرے ہوئے پایا۔ سب کے چہروں پر فکر اور تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ کچھ دیر پہلے تک جن ہم وطنوں کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے اب انہیں کے خلاف صف آراء تھے۔ لیکن وہ مجبور تھے، اپنے ہائی کمانڈ کے حکم کے سامنے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ سبھی روزہ دار ہیں۔ ان میں سے چند ظہر کی نماز کے لیے وضو کرتے نظر آئے۔

آر۔ایس۔ایف کی جڑیں سن 2000 کی دہائی کے اوائل میں دارفور (Darfur) کے لیا گیا، یہ فورس براہِ راست اس وقت کے صدر عمر البشیر کو جواب دہ تھی۔ بعد ازاں 2017 میں ایک قانون کے ذریعے اسے ایک خودمختار سیکیورٹی فورس کا درجہ دے دیا گیا۔

2019 اور 2021 کے فوجی انقلاب کے بعد سے اور 15 اپریل 2023 تک، یعنی جنگ چھڑنے تک جنرل عبدالفتاح البرہان سوڈان کے صدر اور حمیدتی نائب صدر رہے۔

One Nation One Army کے تحت جنرل البرہان نے مطالبہ کیا کہ آر۔ایس۔ایف کو باضابطہ طور پر فوج کے ماتحت کر دیا جائے۔

کئی مہینوں سے دونوں قیادتوں کے ائرپورٹ کی دیوار سے متصل، اور ائرپورٹ کے گیٹ سے تقریباً 900 میٹر کے فاصلے پر۔ اس میں مسلح افواج کی تینوں سروسز ہوائی، بحری اور بری افواج کے ہیڈکوارٹر تھے، تمام سینیر کانڈز کے علاوہ کمانڈران چیف یعنی صدر کی رہائش گاہ بھی اسی میں تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لڑائی شروع ہونے کے وقت صدر البرہان بھی کمپاؤنڈ کے اندر تھے۔

بہرحال ائرپورٹ کے باہر کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔ دو تین پرائیویٹ گاڑیاں کسی طرح آ گئی تھیں اپنے عزیز و اقارب کو واپس لے جانے کے لئے۔ پتہ چلا کہ جنگ خرطوم میں کئی محاذوں پر چل رہی ہے۔ خاص طور پر اہم ملٹری

تنصیبات کے اطراف میں۔

جس وقت ہم ائرپورٹ سے نکل کر باہر آئے تمام سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔سوائے آر۔ایس۔ایف فوجیوں کے نہ آدم نہ آدم زاد، نہ کوئی گاڑی نہ سواری۔ سب مسافر جن میں بچے عورتیں بوڑھے جوان، جہاز کا عملہ، پائلٹس وغیرہ ہاتھ میں کیبن ٹرالی یا بیگ لیے ہوئے رمضان کے مقدس مہینے میں، زیادہ تر روزہ کی حالت میں، شدید گرمی اور دھوپ میں، سڑکوں پر بے یارو مددگار چلے جا رہے تھے۔ مجھے جس راستے سے واپس جانا تھا وہ آرمی کمپاؤنڈ کے پاس سے گزرتا تھا لیکن وہاں گھمسان کی لڑائی جاری تھی۔ائرپورٹ شہر کے وسط میں واقع تھا۔ اس کے اطراف میں اور آس پاس گھنی آبادی تھی۔اس علاقے کے راستوں سے میں واقف تھا اس لیے اندرونی راستوں پر چلنا شروع کر دیا، میرے ایک ہاتھ میں کیبن ٹرالی تھی اور کاندھے پر لیپ ٹاپ لٹکا ہوا تھا۔میری کوشش تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے لڑائی کے محاذ سے دور ہو جاؤں۔ کچھ دور تک جگہ جگہ آر۔ایس۔ایف کے جوان ملتے رہے لیکن کسی نے نہ مجھے روکا اور نہ کچھ پوچھا۔ ویسے بھی سوڈانی لوگ ہندوستانیوں کی بہت قدر کرتے ہیں اور عزت سے پیش آتے ہیں۔

گولی کہاں سے آئی؟

راستے میں آر۔اس۔اف کے ایک گروپ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک نزدیک سے فائرنگ کی آواز سے دل دہل گیا۔ گھوم کر دیکھا تو اس گروپ کا انچارج اپنے ماتحت کو جو کچھ فاصلے پر تھا، غصہ کی حالت میں کچھ کہہ رہا تھا اور ہوائی فائرنگ کر کے اپنے غصہ کا اظہار کر رہا تھا۔ میرے لیے وہ وقت دل دہلانے یا دل تھامنے کا نہیں تھا، بلکہ دل کو سنبھالنے کا تھا۔اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے میرے سامنے سات آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ باقی تھا، میں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ بظاھر میں اندرونی راستوں پر چل رہا تھا، مگر وہاں بھی آس پاس میزائل گرتے رہے، کہیں کہیں نزدیک سے دھماکوں کی آوازیں آتی رہیں، کوئی گولی زوں کرتی ہوئی اوپر سے گزر جاتی، کوئی پہلو سے نکلتی ہوئی کسی درخت میں سما جاتی۔ کہاں سے آئی؟ یہ سوال آج بھی جواب کا منتظر ہے۔

چلتے چلتے ائرپورٹ سے کافی دور آ چکا تھا مگر فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ راہ میں اکا دکا لوگ بھی مل جاتے تھے لیکن ٹریفک بالکل نہیں تھا۔سب آفس بند تھے، لوگ خاموشی سے اپنے اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔

اب میں ایسے سنسان علاقے سے گزر رہا تھا جہاں عام دنوں میں بھی لوگ پیدل چلتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اپنے آپ کو کسی بھی صورتحال سے نمٹنے کے لیے آمادہ کیا۔قسمت تھی کہ آج وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

اس جگہ کو عبور کرنے کے بعد پبلک ٹرانسپورٹ ایریا تھا جہاں کچھ لوگ نظر آئے جو بظاہر کسی سواری کی امید میں پریشان سے کھڑے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں سوق عربی میں اپنے 8 انڈین اسٹاف کے پاس پہنچ گیا جو ایک بلڈنگ کی پانچویں منزل پر رہتے تھے۔

سوق عربی خرطوم کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ اس میں زیادہ تر موبائل، کمپیوٹر اور الیکٹرانک سامان کی دوکانیں تھیں اس کے علاوہ سوڈان کی سب سے بڑی سونے کی مارکیٹ بھی یہیں تھی لیکن اس وقت سب کچھ بند تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا ہے کہ جنگ کئی محاذوں پر ہورہی تھی۔ کئی اہم عمارتیں اور علاقے آر۔ایس۔ایف کے قبضے میں آچکے تھے۔سوق عربی جہاں ہم تھے وہ بھی انھیں کے تسلط میں تھا۔رات کے وقت لڑائی میں شدت آجاتی۔ رمضان المبارک کی رونق ختم ہوچکی تھی، اذان اور تراویح کی آوازوں کی جگہ فائرنگ اور دھماکوں نے لے لی تھی۔نمازی نہ ہونے کی وجہ سے مساجد ویران تھیں۔شب قدر کی مقدس رات سب نے مکانوں کے اندر گزاریں۔

3: ایئرپورٹ سے نکل کر واپسی کا سفر
سنسان سڑکیں، مسلح جوان اور خطرات کے سائے

دو دن اسی طرح فلیٹ میں گزر گئے۔ تیسرے دن کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ باہر نکلے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ فلیٹ سے باہر روڈ کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ وقفے وقفے سے ایک دو آدمی چلتے ہوئے نظر آجاتے۔افطار سے دو گھنٹے پہلے میں اپنے ایک اسٹاف ممبر کے ساتھ باہر نکلا اس امید پر کہ شاید ایک کچی مارکیٹ جس کا نام جاکسن تھا، اس میں کچھ مل جائے۔ یہ مارکیٹ ہماری بلڈنگ سے ایک کلومیٹر دور تھی۔قسمت سے وہاں تین سبزی والے کچھ سبزی لیے بیٹھے تھے۔مزدور طبقہ کے چندلوگ وہاں خریداری کرتے نظر آئے۔جلدی جلدی ہم نے بھی سبزیاں خریدیں۔کچھ آگے بڑھے تو ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور کھلا مل گیا۔ وہاں سے ضروری سامان خرید ہی رہے تھے کہ نزدیک سے فائرنگ کی آواز آئی، جھانک کر دیکھا تو آر۔ایس۔ایف کا ایک جوان ایک ہاتھ میں رائفل سے ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے ایک لڑکے کا کالر پکڑے ہوئے گزر رہا تھا۔دوکان دار نے جلدی سے شٹر کو جہاں تک ہوسکتا تھا نیچے کیا۔دوکان کے باہر کچھ لوگ رہ گئے تھے وہ جوان ان کو وارننگ دیتے ہوئے گزر گیا کہ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ گولیوں سے سب کو بھون دوں گا۔جب خطرہ ٹل گیا تو دوکان دار نے شٹر اٹھایا اور ہم نے تیزی سے اپنی راہ لی۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ گولیوں سے نہیں بھنے، ہاں دوکان سے بھنے ہوئے چنے مل گئے اور افطار کے لیے پکوڑیاں تلنے کے لیے تیل بھی۔

جنگ کے جلدی رکنے کے بظاہر کوئی آثار نہیں تھے۔زیادہ تر لوگ اور خاندان محفوظ علاقوں کی طرف منتقل ہونے لگے تھے۔ آر۔ایس۔ایف کے جنگجوؤں نے خود کو اونچی عمارتوں میں محفوظ کر رکھا تھا کیوں کہ آرمی کے پاس ائرپاور (air power) تھی اور جہاں جہاں مخالف گروپ کے لوگ تھے یا پناہ لے رکھی تھی ان پر فضائی حملے کر رہے تھے۔سوق عربی میں بھی کئی حملے ہوئے۔ایک دن نیچے سے فائرنگ کی آوازیں آئیں۔جھانک کر دیکھا تو دونوں گروپ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کیونکہ وہ بازار تھا، وہاں تجارتی عمارتیں تھیں میدان نہیں تھا گوریلا جنگ کی صورت میں ہی لڑا جا سکتا تھا۔

جب کبھی باہر چند لوگوں کو آتے جاتے دیکھتے اندازہ ہوجاتا کہ آس پاس کوئی خطرہ نہیں ہے، ہم بھی باہر نکلتے۔زیادہ تر دوکانیں لٹ چکی تھیں، ان کے دروازے کھلے پڑے تھے اور غیر ضروری سامان بکھرا پڑا تھا۔چند سونے کی دوکانیں بھی لوٹی جاچکی تھیں۔

پریشان کن سوال

ہم سب کو بار بار یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ اس حصار سے کب اور کیسے نکلیں، اور نکل کر کہاں جائیں۔انڈین ایمبیسی بند تھی۔سیکیورٹی کی وجہ سے اسٹاف کے لوگ بھی محصور تھے اور اپنی اپنی رہائش گاہ سے کام کر رہے تھے۔ہم

ان سے رابطے میں تھے۔انھوں نے یقین دلایا کہ جیسے ہی یہ طے ہوتا ہے کہ فلائٹ کہاں اترے گی،حکومت ہندفورا فلائٹ بھیج کر سب ہندوستانیوں کونکالنا شروع کردے گی۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ خرطوم ائرپورٹ پر اوراس کے آس پاس شدید جنگ جاری ہے،ائرپورٹ بھی تباہ ہوچکا ہے اوراس قابل نہیں کہ کوئی فلائٹ اتر سکے۔

اسی اثناء میں عید الفطر آ گئی۔ جنگ کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔مساجد کے لاؤڈ اسپیکر خاموش تھے۔دور سے ایک مسجد سے نماز عیدکی آواز آرہی تھی۔نیچے اترنے کی ہمت نہیں ہوئی۔آس پاس چند انڈین اور رہتے تھے۔وہ بھی ہمارے فلیٹ میں آ گئے۔ نماز عید کی ذمیداری مجھے سونپی گئی۔زندگی میں پہلی بار عید کی نماز پڑھائی۔خطبہ Google سے مل گیا۔خوش قسمتی سے موبائل اورانٹرنیٹ سروسز کبھی بند نہیں ہوئیں۔

23 اپریل کو ایمبیسی سے اطلاع ملی کہ پورا اسٹاف شہر سے باہر ایک کمپاؤنڈ آراک سٹی (Arak city) میں منتقل ہورہا ہے وہاں بیٹھ کر وہ تمام ہندوستانیوں کو شہر کے مختلف علاقوں سے بسوں کے ذریعے نکلوا کر پہلے آراک سٹی میں جمع کریں گے، اس کے بعد بسوں کے ذریعے ہی سب کو پورٹ سوڈان (Port Sudan) پہنچایا جائے گا۔وہاں سے اسپیشل فلائٹ یا بحری جہازوں کے ذریعے جدہ، سعودی عرب اور وہاں سے ممبئ یا دہلی پہنچایا جائے گا۔پورٹ سوڈان خرطوم سے تقریبا 850 کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔یہ سوڈان کی بندرگاہ ہے اور بحر احمر (Red Sea) پر واقع ہے۔

پورے سوڈان میں اس وقت تین ہزار سے زیادہ ہندوستانی موجود تھے زیادہ تر خرطوم اوراس کے آس پاس رہتے تھے۔کافی لوگ اپنی فیملی کے ساتھ تھے۔ان سب کو پورے خرطوم سے نکال کرلانا جوئے شیرلانے سے کم نہ تھا۔

سفارتخانے کی طرف سے سواری کو ہمارے پاس تک آنے جانے کے لیے کئ حساس علاقوں سے گزرنا تھا۔اس کے علاوہ سواری خدا جانے کب پہنچے، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ ایمبیسی کیمپ ہم خود چلتے ہیں۔پتہ چلا کہ صبح فجر کے بعد جاکسن کے پاس سواری مل جاتی ہے۔اگلی صبح کوسورج طلوع سے پہلے میں اورایک اسٹاف ممبر سواری کی تلاش میں نکلے مگر کوئی سواری نہ ملی۔کسی نے بتایا کہ شاید سامنے فلائی اورعبور کرنے کے بعد مل جائے۔ ہمت کرکے قدم بڑھائے۔راستے میں جگہ جگہ چند لاشیں پڑی ملیں۔کسی بھلے انسان نے ان کو درخت کی پتے دارٹہنیوں سے ڈھانک دیا تھا۔دوروز پہلے رات کے وقت یہاں جھڑپیں ہوئی تھیں۔فلائی اور پر ہم دونوں تنہا چلے جارہے تھے۔ نیچے ریل کی پٹریاں تھیں۔فلائی اوور سے نیچے اترتے وقت سامنے روڈ پر چند لوگوں کے دو گروپ نظر آئے۔ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے یا لوہے کی سلاخیں تھیں۔یہ منظر دیکھتے ہی ہمارے سینوں میں دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوگئی۔صورت حال کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ان کہ قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں نے بلند آواز سے سلام کیا، واپسی میں سلامتی کا پیغام آیا۔دل میں اللہ کی حمد وثناء کی۔ان سے اپنا تعارف کرایا اورمدعا بیان کیا۔وہ بولے اسی روڈ پر ایک دوکلومیٹر کے بعد شاید سواری مل جائے۔مگر ہمارے اندر مزید خطروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی، ان سب کا شکریہ ادا کرکے اوران پر اللہ کی سلامتی ورحمت کی دعا کرتے ہوئے واپس لوٹ چلے۔

دوسری صبح ہمارے سوڈانی پارٹنر احمد البوادری تلاش کرکے ایک وین لے آئے۔ ہمارے گروپ کے علاوہ چار ہندوستانی اور تھے۔وین ہم بارہ ہندوستانیوں کا قافلہ لے کر روانہ ہوئی۔اس نے ایسے راستوں کو چنا جو پر امن تھے۔کچھ علاقے آرمی کے تحت تھے کچھ مخالف گروپ کے تسلط میں۔تمام تجارتی مراکز اور کارخانے بند تھے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ بجلی پانی اور موبائل سروسس کے علاوہ ہر ادارہ بند تھا۔

تقریبا ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم انڈین ایمبیسی کیمپ پہنچ گئے جو وقتی طور پر آراک سٹی کمپاؤنڈ میں قائم کیا گیا تھا۔یہ ایک پرائیویٹ کمپاؤنڈ تھا چاردیواری کے بیچ میں۔اس میں بہت سای

کوٹھیاں تھیں جن میں زیادہ تر غیر ملکی اور سفارتی عملے کے لوگ رہتے تھے۔ ہندوستانی سفارت خانہ نے یہاں وقتی طور پر چند کوٹھیاں کرایہ پر لی تھیں تاکہ تمام ہندوستانیوں کو پورے شہر سے جمع کر کے یہاں لایا جائے پھر بسوں کے ذریعے پورٹ سوڈان روانہ کر دیا جائے۔ ایمبیسی کا پورا عملہ اپنی فیملیوں کے ساتھ یہاں منتقل ہو چکا تھا۔ ہندوستانی سفیر بی۔ اس۔ مبارک بھی اپنی فیملی کے ساتھ کیمپ میں تھے۔

جنگ چھڑنے کے بعد لوگوں پر کیا گزری، اس کے بارے میں وہاں موجود ہر ہندوستانی کی زبان پر الگ الگ کہانی تھی۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہندوستانیوں کا ایک بڑا قافلہ پورٹ سوڈان کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اگلی صبح ہمیں بھی ایک بس میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ راستے میں بھی وہی صورت حال تھی جو خرطوم میں تھی۔ یعنی کچھ علاقے آرمی کے تحت کچھ مخالف گروپ کے تحت۔ تمام تجارتی مراکز بند تھے مگر کھانے پینے کی دوکانیں کھلی تھیں۔۔

تقریباً 12 گھنٹے کے سفر کے بعد ہم پورٹ سوڈان پہنچ گئے یہ سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ یہاں ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ انڈین ایمبیسی نے یہاں ایک بڑے اسکول میں ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ سینکڑوں ہندوستانی پہلے سے موجود تھے جو سوڈان کے مختلف شہروں سے خود یہاں پہنچ چکے تھے۔ ایمبیسی اور اس کا عملہ خرطوم میں تھا اور وہیں سے تمام امور کی نگرانی کر رہا تھا۔ یہاں پورٹ سوڈان میں انتظامات کے لیے انڈین وزارت خارجہ نے سوڈان کے آس پاس کے ملکوں میں موجود ہندوستانی سفارت خانوں کے عملے کو بھیج رکھا تھا۔ ایمبیسی کی جانب سے وہاں موجود سبھی ہندوستانیوں کو کھانے کے پیکیٹ تقسیم کیے گئے۔

اگلے روز معلوم ہوا کہ ہندوستانی نیوی کا ایک سمندری جہاز لوگوں کو لے جانے کے لئے بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا ہے اور ائرفورس کا مال بردار جہاز پہنچنے والا ہے۔ یہ دونوں جہاز ہم سب ہندوستانیوں کو لے کر جدہ، سعودی عرب تک جائیں گے وہاں سے کچھ اور انتظام کیا جائے گا۔ ہمارے پورے گروپ کو ہندوستانی ائرفورس کے جہاز میں جگہ ملی۔ 26 اپریل کو سوار ہوتے ہی مادر ہند کی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آتے محسوس ہوئے۔

کیوں کہ ہمارا جہاز انڈین ائرفورس کا تھا اس لیے وہ جدہ کے ائربیس پر اترا۔ جہاز سے باہر نکلنے پر ہمارا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ اس وقت ہندوستانی وزارت خارجہ کے وزیر مملکت وی۔ مرالی دھرن اور سعودی عرب میں ہندوستانی سفیر ڈاکٹر سہیل اعجاز خان، جدہ میں ہندوستانی قنصل جنرل فھد خان سوری وغیرہ ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہمارے رہنے کا انتظام انڈین کمیونٹی اسکول، جدہ میں کیا گیا تھا۔ صاف ستھرے بستر کلاسوں میں بچھے تھے۔ نہانے دھونے کے لیے سب کے لیے نئے تولیے، صابن، ٹوتھ برش وغیرہ مہیا تھے۔ جدہ کے ایک اچھے ریسٹورنٹ سے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جدہ میں موجود میرے جاننے والوں میں کئی لوگ مجھ سے ملنے آئے۔ میرے عزیز دوست اور ہمدرد احتشام شمسی جن کا تعلق رامپور سے ہے، منتظمین سے اجازت لے کر مجھے اپنے گھر لے گئے اور میرے اعزاز میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔

جدہ کی اور جدہ میں بسنے والے ہندوستانیوں کی گرم جوشی اور مہمان نوازی سے میں پہلے سے واقف تھا۔ دل چاہتا تھا کچھ وقت اور گزاروں مگر اصل میزبان ہندوستانی سفارت خانہ تھا اور اس کے پروٹوکول و تعلیمات کو ماننا فرض تھا اس لیے اگلے روز 28 اپریل 2023 کو ہندوستانی ائرفورس کے دوسرے ٹرانسپورٹ جہاز میں سوار ہوئے۔ داخل ہوتے وقت ایسا لگا جیسے مادر وطن دونوں بازو پھیلائے ہوئے اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے چین ہے۔ کچھ ہی دیر میں جہاز فضا کی بلندیوں کو چومتے ہوئے دلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب!

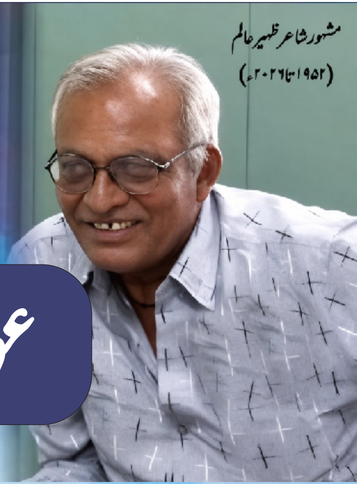

ظہیر عالم

عوامی احساسات وجذبات کے شاعر

ڈاکٹر اظہر حیات
(ناگپور)

معروف ومقبول نغمہ نگاروشاعر جناب ظہیر عالم صاحب ۱۰رمئی ۲۰۲۶ءکورات گیارہ بجے رحلت کر گئے۔وہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔

ظہیر عالم یکم جون ۱۹۵۲ءکو ناگپور میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد کا نام عبدالحفیظ تھا۔وہ بنکری کے پیشے سے وابستہ تھے۔معاشی تنگدستی کے باعث ظہیر عالم چوتھی جماعت سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر فطری شاعرانہ صلاحیت نے کم عمری ہی میں انہیں شعروسخن کی دنیا سے جوڑ دیا۔

وہ مشہور زمانہ گیت ’’تم توٹھہرے پردیسی ساتھ کیا نبھاؤ گے‘‘ کے خالق تھے۔اس گیت نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور انھیں لازوال شہرت عطا کی۔حقیقت یہ ہے کہ ان کے بیشتر نغمے عوامی احساسات کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں کہ دل میں اتر جاتے ہیں۔

ان کا ایک اور مقبول گیت آج بھی ملک و بیرون ملک ذوق وشوق سے سنا جاتا ہے:

ماں تیرے دودھ کا حق ہم سے ادا کیا ہوگا
تو جو ناراض ہو، خوش ہم سے خدا کیا ہوگا

ظہیر عالم کے کلام کی بڑی خوبی اس کی سادگی، عام فہم زبان اور جذبات کی سچی عکاسی ہے۔ان کے غیر فلمی گیتوں اور نغموں نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا۔’’مسلمانوں سنبھل جاؤ قیامت آنے والی ہے‘‘،’’غم جدائی کا یوں تو بہت تھا مگر۔۔۔دور تک ہاتھ پھر بھی ہلانا پڑا۔‘‘ نمایاں ہیں۔

اس کے علاوہ ’’آوارہ ہوا کا جھونکا ہوں‘‘، ’’دونوں ہی محبت کے‘‘،’’تیری یاد آئی‘‘ اور یاروں میں نے پنگا لے لیا‘‘ جیسے نغمے آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔

بات نغموں اور گیتوں کی چل رہی ہے تو دلتوں کے مسیحا بھیم راؤ امبیڈکر سے منسوب گیت کا ذکر بھی ضروری ہے جسے ان کے ماننے والے آج بھی عقیدت و احترام سے گاتے اور سنتے ہیں۔اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بھیم جی نے ہم، دلتوں کو اونچا اٹھا دیا
ذرے کو آسمان کا تارا بنا دیا
شبدوں کی کل تلک ہمیں پہچان تک نہ تھی
لکھنا سکھا دیا ہمیں پڑھنا سکھا دیا
ایک دوسرے کا بوجھ اٹھانے لگے ہیں ہم
تم نے ہمارے ہاتھوں کو لوہا بنا دیا

شہرت ومقبولیت کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود ظہیر عالم منکسر المزاج، تواضع و انکساری کے پیکر تھے۔وہ زندگی کی حقیقتوں سے بخوبی واقف تھے۔ان کا یہ شعر ان کی شخصیت کا آئینہ دار محسوس ہوتا ہے:

بہت اونچائیوں میں بھی بھٹک جانے کا خطرہ ہے
فضاؤں میں اڑو لیکن زمیں سے واسطہ رکھنا

ان کے بعض اشعار تو اردو دنیا میں مقبول خاص و عام ہیں لیکن لوگ آج بھی ان اشعار کے خالق سے ناواقف ہیں۔

گھر سے نکلو تو پتہ جیب میں رکھ کر نکلو
حادثہ چہرے کی پہچان مٹا دیتا ہے

خاموش مزاجی تمھیں جینے نہیں دے گی
اس دور میں جینا ہے تو کہرام مچا دو

پاپا کھلونے بیچ کے آٹا خرید لو
بھوکے ہیں گھر کے لوگ یہ کس کام آئیں گے

میرے بچوں کا صبر بھی کیا مثالی ہے
جا رہے ہیں میلے میں اور جیب خالی ہے

میں کہ مٹی کے کھلونے بھی اسے دے نہ سکوں
اس کا بچپن ہے کہ جاپان کی گڑیا مانگے

دشوار ہوگیا ہے کھلونے خریدنا
اب کیسے بچے گڑیا کی شادی رچائیں گے

یہ اشعار دراصل ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کا آئینہ ہیں۔ ان میں نہ لفظوں کی ملمع سازی ہے اور نہ ہی تصنع و بناوٹ، اس لیے قاری متاثر ہوتا ہے۔

ظہیر عالم نے کبھی کلام کی اشاعت پر توجہ نہیں کی بلکہ اس معاملے میں وہ قدرے سست واقع ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کا سارا کلام مختلف بیاضوں میں ان کے شکستہ قلم سے لکھا موجود ہے۔ ان کا کلام زیور طباعت سے آراستہ ہوکر شایع ہوجائے تو یقیناً اُردو شاعری میں خوشگوار اضافہ ہوگا۔

انتقال کے دس روز قبل ان کی رہائش گاہ پر ملاقات ہوئی تو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی دنیا سے رخصت ہوجائیں گے۔ البتہ اس وقت ان کی زبانی جو اشعار سنے تھے اس سے ایک انجانا سا خدشہ ضرور محسوس ہوا تھا۔ شعر ملاحظہ فرمائیے:

مجھ کو معلوم ہے دنیا کی حقیقت کیا ہے
زندگی تو بھی چلے جائے گی دھوکہ دے کر

کیا اب نباہ کی کوئی صورت نہیں رہی
اے رُوح جا رہی ہے بدن چھوڑ کر کہاں

خاک تو چھان چکے سارے جہاں کی عالم
اب ہمیشہ جہاں رہنا ہے وہیں گھر دیکھو

اللہ نے ظہیر عالم صاحب کو تین بیٹیاں اور ایک بیٹے سے نوازا تھا۔ بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھروں میں خوش ہیں اور سعادت مند بیٹا گاڑیوں کا میکینک ہے۔

ان کی ساری زندگی شعر و سخن کی خدمت میں گزری، انہیں نہ ستائش کی طلب تھی نہ ہی شہرت کی آرزو۔ سادگی اور قناعت ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ ۱۹۹۹ میں راقم جب مہاراشٹر راجیہ اردو اکادمی کا رکن تھا اس وقت عالم صاحب کے لیے حکومت مہاراشٹر سے وظیفے کی سفارش کی تھی جو منظور بھی ہوگئی جو انہیں آخر تک ملتی رہی۔

اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

چنچل کوڑہ کی سیر (بقیہ)

آج تک میری یادوں کا روشن ترین منظر ہے۔ اسی دوران محلے کے بزرگ ہاشم علی صاحب دیوڑھی کے دروازے پر کھڑے بلند آواز میں اعلان کر رہے تھے: ”لوگو! یاد رکھو، چارمینار کا مینار بھی ڈوب جائے تو پانی میری جوتی تک نہیں پہنچ سکتا۔“

ان کی بات مبالغہ سہی، مگر حقیقت یہ تھی کہ چنچل گوڑہ نسبتاً بلند مقام پر آباد تھا۔ محلے کی سڑک پر چلتے ہوئے ایک طرف گورنمنٹ پریس کی بلند و بالا دیواریں نظر آتی تھیں اور دوسری طرف کرما گوڑہ کا علاقہ، جہاں قدیم مندر اپنی تاریخی شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔ آگے بڑھیں تو چنچل گوڑہ سینٹرل جیل دکھائی دیتی ہے، جو آصف جاہی دور کی ایک اہم تاریخی عمارت ہے۔ آزادی کی تحریک سے وابستہ کئی شخصیات یہاں قید رہیں، اور آج یہ جگہ تاریخ کی خاموش گواہ بن کر کھڑی ہے۔ جیل سے نیچے اترتے ہی کبھی سعدی کیفے ہوا کرتی تھی، جہاں شہر کے لوگ بیٹھ کر چائے کی چسکیوں کے ساتھ سیاست، ادب اور زندگی پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس کے سامنے چنچل گوڑہ ہائی اسکول تھا، جس کے وسیع میدان میں سیرت کے جلسے، مشاعرے اور قومی تقریبات بڑی شان سے منعقد ہوتی تھیں۔ اسی محلے کی گلیاں اچھو میاں کی ملگیوں، مہدوی برادری کی مسجد، دیوڑھی نواب دُلہ خان اور پرانی آبادیوں سے گزرتی ہوئی حیدرآباد کی تہذیب کا زندہ نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ہر گلی ایک داستان ہے اور ہر دروازہ ایک تاریخ۔

چنچل گوڑہ نے صرف عمارتیں ہی نہیں، بلکہ باکمال انسان بھی پیدا کیے۔ بزرگ شاعر سرفراز علی ناوک، اکرام جاوید، علی الدین نوید، طالب خوندمیری، اشرف خوندمیری، مسرور عابدی اور دیگر ادبی شخصیات نے اس محلے کی علمی شناخت کو روشن کیا۔ انہی گلیوں میں زندگی کے ابتدائی سبق سیکھنے والا یہ خاکسار بھی خود کو اسی مٹی کا ایک معمولی ذرہ سمجھتا ہے۔ وقت کے ساتھ عمارتیں بدل گئیں، کئی کیفے مٹ گئے، میدان سکڑ گئے، چہرے بچھڑ گئے، مگر یادوں کی بستی آج بھی وہیں آباد ہے۔

جب کبھی دل ماضی کی طرف سفر کرتا ہے تو چنچل گوڑہ کی گلیاں خاموشی سے آواز دیتی ہیں: ”یہ محلہ بہت حسین تھا میاں، میرا گھر بھی یہیں کہیں تھا میاں۔“

غزل

تابش رودولوی (ایودھیا)

ایک احساس کہ ہمیں اپنا پرستار کیا
ایک تحفہ کہ محمد کو جہاں دار کیا
ایک صورت جو ہمیں سب میں نظر آتی ہے
ایک سیرت کہ ہمیں صاحبِ کردار کیا
ایک پردہ کہ مشیت کو چھپائے ہے ابھی
ایک جلوہ جو ہر اِک شے میں نمودار کیا
ایک احمد کہ بہت پاس سے دیکھا رب کو
ایک موسیٰؑ کہ بہت دور سے دیدار کیا
ایک وہ خاک کہ جس سے ہوئی آدم کی نمود
ایک وہ خاک کہ جس سے ہمیں تیار کیا
ایک وہ حرف کہ تخلیق دو عالم کا سبب
ایک وہ لفظ کہ معصوم نے انکار کیا
ایک نفرت کہ ابھی تک ہے اندھیروں کی اسیر
ایک اُلفت کہ ہر اِک دل کو ضیا بار کیا
ایک وہ درد جو احساس کی پرتوں میں رہا
ایک وہ کرب کہ آنکھوں کو گہر بار کیا
ایک وہ لوگ جو لڑتے ہیں مظالم کے خلاف
ایک وہ جن کو مظالم کا طرفدار کیا
ایک وہ جھوٹ کہ غیرت نے چھپایا دل میں
ایک وہ سچ کہ محبت کو سبک سار کیا
ایک وہ خواب کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں
ایک وہ خواب کہ جس نے ہمیں بیدار کیا
ایک نخوت کہ نہ ہونے دیا انساں ہم کو
ایک نسبت کہ ہمیں حق کا پرستار کیا
ایک منکر کی اداؤں میں گیا ہے ایماں
ایک کافر کی نگاہوں نے گنہگار کیا
ایک بھی وصفِ تکلم نہ تھا ہم میں تابش
ایک اللہ نے ہمیں لائقِ گفتار کیا

ڈاکٹر گوہر مسعود (فتحپور)

گرمیوں کا موسم ہے، تتلیاں تڑپتی ہیں
آنسوؤں کا دریا ہے، مچھلیاں تڑپتی ہیں

جانے کون بچھڑا ہے، تتلیاں تڑپتی ہیں
آسمان روتا ہے، بجلیاں تڑپتی ہیں

آنسوؤں کے ساگر میں جگنوؤں کا جھرمٹ ہے
سب کنارے ڈوبے ہیں، پتلیاں تڑپتی ہیں

درد کے پہاڑوں سے برف جب پگھلتی ہے
سرد سرد لہروں میں سسکیاں تڑپتی ہیں

درد کے سمندر میں کشتیاں اتاریں گے
ڈوبتے کناروں پر چیونٹیاں تڑپتی ہیں

درد کے شکارے پر دھوپ تیری یادوں کی
جھیل کے کناروں پر کشتیاں تڑپتی ہیں

آگ لگ گئی گوہرؔ، دنیا بھر کی چیزوں میں
بھوک کی وہ شدت ہے، بستیاں تڑپتی ہیں

سرفراز بزمی (راجستھان)

امن کی فاختہ، پروں کے زخم
بے بسی دیکھ زرگروں کے زخم

راہِ حق، خون، وادیٔ طائف
پاک نعلین، پتھروں کے زخم

عجز موسیٰ، رعونت فرعون
بھولیے مت سمندروں کے زخم

سرخ کونپل ہے پھر نوید بہار
ہنس رہے ہیں قلندروں کے زخم

فاقہ مستو! تمھیں نہیں معلوم
ان اُنیندے تونگروں کے زخم

گھاؤ اب بھی ہرے ہیں طعنوں کے
بھر گئے سارے خنجروں کے زخم

بادبانوں سے پونچھ لیتی ہے
میری کشتی سمندروں کے زخم

گھر کے گھر بے چراغ ہیں بزمی
کس کو معلوم ان گھروں کے زخم

غزل

ڈاکٹر عائشہ سمن
(ممبئی)

لفظوں کی تعبیر کروں
ذات تری تحریر کروں

نقش دلوں پر ہو جائے
میں اپنی تقریر کروں

رانجھے کی تمثیل ہو تم
کیوں نہ خود کو میر کروں

خوبی وہ بخشی رب نے
شعلوں کو بھی نیر کروں

اک روح کے رہیں گے ہم
الفت کو زنجیر کروں

دنیا روش ہو روش ہو
سیرت کو تنویر کروں

سارے لفظ مقدس ہوں
جب ذکر شیر کروں

دل میرا انمول رتن
زند کے جاگبر کروں

عشق کروں ، فریاد ہنوں
جاری جوئے شیر کروں

ہر محفل میں ذکر ترا
اول اور اخیر کروں

ہر لب پر ہو دعا سمن
ایسی پیش نظیر کروں

سچ بولوں ، انسان ہنوں
زندہ مرا ضمیر کروں

سرمایا دل کا دے کر
جاناں تجھے امیر کروں

خوب نوازا ہے رب نے
میں فخر تقدیر کروں

جو ہوتا ہے سو ہو گا
کیوں خود کو دلگیر کروں

اللہ راضی ہو جائے
پھر ایسی تدبیر کروں

جو بھی دل میں ہے میرے
سب کا سب تحریر کروں

اپنی ساری غزلوں کا
لہجہ مثل میر کروں

جس میں ٹیڑھا پن ہو سمن
سیدھی وہی لکیر کروں

نظم ''کبھی''

مقصود خاں علیگ

عشق بھی کرتا ہوں
عقل بھی باقی ہے

دن میں کسب زرد ہے
رات میں آرام ہو

تندرستی بھی ہے
روح بھی مسرور ہو

چشم بھی پرنور ہو
دل کے اندر چین ہو

یہ کبھی ممکن نہیں

کچھ کجی ہے ذہن میں

افسانہ

ذرا دھیرے چلو جی

اطہر اسلوبی

(جدہ)

اماں بی نے چھتیسویں لڑکی کو بھی ریجکٹ کر دیا۔

مگر قسم لے لو کہ جو مشاطہ کو گراں گزرا ہو۔

وہ ہر بار اپنی زنبیل سے اک نئی تصویر اور بائیو ڈاٹا یوں نکال رہی تھی جیسے جادوگر اپنے کوٹ کی جیب سے کبوتر نکالتا ہو۔

اور فوٹوز بھی یوں قرینے سے پیش کر رہی تھیں مانو آبگینہ ہو جو ذرا سی غفلت سے بکھر جائیگا۔

اور ہم سکوت شب کی تصویر بنے اپنی قسمت کی پری کو اس کی قید سے آزاد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

بلا آخر اماں بی کو اٹھیاسی نمبر کی ایک فوٹو پسند آ ہی گئی۔

مگر ہائے رے ہماری قسمت!

بقول مشاطہ کے اس لڑکی کا آج ہی رشتہ طئے پا گیا تھا اور "وہ" غلطی سے اس کی فوٹو الگ کرنا بھول گئی تھی۔

پھر کیا تھا!

وہی ہوا جو اماں بی اکثر کیا کرتی تھیں۔

جھنجھلا کر مشاطہ کو مزید فوٹوز دکھانے سے منع کر دیا اور مشاطہ کے ہاتھ میں آنے جانے کا کرایہ اور اس کی فیس کی مد میں ایک ہزار روپے تھما کر اسے بھگا دیا۔

یا حیرت!

اتنی سی چیز کے ہزار روپے لینے کے باوجود بھی مشاطہ منہ بنا کر بڑبڑاتی چلی گئی۔

مشاطہ کے بقول کوئی رضیہ آنٹی تھیں وہ جب بھی اسے بلاتیں تو دو ہزار سے ایک روپیہ کم نہیں دیتی تھیں۔

ہم بیٹھے انگلیوں پر گننے لگے کہ اگر صبح سے شام تک مشاطہ کے دس وزٹ ہو جائیں تو شام تک دس ہزار روپے بن جائیں گے۔

یعنی ایک دن کے دس ہزار تو ماہانہ آمدنی تین لاکھ روپے اور ساتھ میں چائے ناشتہ الگ سے۔

ہمیں لگا کہ انجینئرنگ چھوڑ کر میریج بیورو کھول لیا جائے۔

دراصل ہماری انجینئرنگ کی پڑھائی ختم ہوتے ہی ایک پرائیویٹ فرم میں پچاس ہزار روپے ماہوار کی جاب مل گئی۔

پھر کیا تھا!

اماں بی کو ہماری شادی کی فکر لگ گئی۔ ہم نے لاکھ سمجھایا کہ پہلے کچھ رقم تو جمع ہو لینے دیں

تاکہ شادی کے اخراجات وغیرہ خود ہی اٹھا سکیں مگر اماں بی کا جواب تھا کہ وہ سب انتظام خودبخود ہو جائے گا تم انجینئر ہو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

ہمارا تعلق اوسط درجہ کے گھرانے سے تھا مگر اماں بی بڑے گھرانوں کی لڑکیاں تلاش کررہی تھیں اور اسی کوشش میں وہ فرسٹ انویسٹمنٹ مشاطہ و میرج بیوروز پہ کررہی تھیں۔ حالانکہ پڑوس کی غزالہ آنٹی کی بیٹی نائلہ بھی نہایت خوبصورت تھی اور ہمیں پسند بھی تھی اور خود غزالہ آنٹی نے بھی دو ایک بار اشاروں کنائیوں میں اپنی رضامندی کا اظہار بھی کیا تھا مگر اماں بی کو تو بگ شاٹ گھرانے کی تلاش تھی۔ اسی چکر میں کئیں ایک میرج بیوروز و مشاطہ کے پیچھے خطیر رقم خرچ کر چکی تھیں۔

پھر ایک دن قسمت ہم پر مہربان ہو ہی گئی۔

ہوا یوں کہ کسی شاپنگ مال میں شاپنگ کرتی ایک نٹ کھٹ سی حسینہ اماں بی کو پسند آ گئی۔

جھٹ سے اماں بی نے اسی سے اس کے والدین کا فون نمبر وغیرہ لے لیا اور فون کر کے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔

ابو جی بھی ہمیشہ کی طرح اماں بی کی ہاں میں ہاں ملا کر ہمیں بتائے بغیر ہی اس لڑکی کے والدین سے ملنے اس کے گھر پہنچ گئے۔ لڑکی کو پسند بھی کر لیا۔ گھر آ کر جب ہمیں بتایا تو ہم بھی ابو جی کے ہی بیٹے تھے، ہم نے کونسا انکار کرنا تھا۔ اور انکار کر کے بھی کیا ہونا تھا، وہی ہونا تھا جو منظور مدر ہونا تھا۔

لئے گھومنے نکلے ہی تھے کہ کار کا پٹرول ختم ہو گیا جسے بھرانے کیلئے رقم درکار تھی اور ہماری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔

پھر کیا تھا! بیگم جھٹ سے خفا ہو کر کار سے اتریں اور روٹھ کر جانے لگیں اور ہم تپتی دوپہر کی دھوپ میں پسینے میں شرابور ان کے پیچھے آواز لگاتے دوڑ رہے تھے کہ ہماری آنکھ کھل گئی۔ اماں بی ہمیں جھنجھوڑ کر نیند سے جگا رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں قدرے سکون ملا کہ ہم اپنے ہی گھر میں ہیں اور یہ واقعی خواب تھا۔

پھر کیا تھا!

ہم اماں بی کے قدموں سے لپٹ گئے اور انہیں اپنا خواب بیان کر دیا۔ جس کار میں پیٹرول بھروانے کیلئے پیسے نہ ہوں ویسی کار کا کیا کرنا؟

نہیں چاہیے ہمیں ایسی جوڑے کی رقم جس کیساتھ گھر میں جوڑی گئی رقم بھی خرچ ہو جائے۔

ایسے ہائی فائی ولیمہ کا کیا کرنا جس میں ہمارا دیوالیہ نکل جائے۔

ایسی شادی کا کیا کرنا جس میں بسنے سے پہلے ہی گھر اندیشوں کے بوجھ تلے دب جائے۔

ہم دولہن بیاہ کر گھر لانا چاہتے ہیں نہ کہ پریشانیوں کو۔

اماں بی رشتہ وہی اچھا جو جوڑ کا ہو، بوجھ نہ ہو۔

اتنا کہہ کے جب سر اُٹھا کر اماں بی کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔

کہنے لگیں بیٹا ہمیشہ والدین ہی صحیح ہوں یہ ضروری تو نہیں۔ کبھی کبھی اولاد بھی صحیح فیصلہ کر سکتی ہے۔

شاید اسی لیے بزرگوں نے فرمایا تھا کہ بہو بناؤ غریب کو بیٹی بیاہو امیر کو۔

اور پھر ہماری شادی پڑوس کی غزالہ آنٹی کی بیٹی نائلہ سے ہی ہو گئی۔ شادی کے بعد ہم اپنی شریک حیات کو گھمانے اپنی پرانی موٹر سائیکل پر انہیں لے کر نکلے ہی تھے کہ ہمارے اندازے سے قبل ہی ہماری گاڑی کا پیٹرول ختم ہو گیا ہم اپنی بائیک کو ڈھکیلتے ہوئے نزدیک کے پیٹرول پمپ کی جانب بڑھنے لگے اور پیچھے ہماری بیگم اپنے حنائی ہاتھوں سے بائک کو ڈھکیلتے ہوئے چل رہی تھیں۔

زندگی کے کسی موڑ پر جب آپ کی گاڑی رک جائے تو شریک حیات آپ کو تنہا چھوڑ کر نکل جانے کے بجائے گاڑی کو دھکا لگا کر منزل مقصود تک پہنچنے میں مدد کرے تو سفر بجائے صعوبت کے تفریح بن جاتا ہے۔ اور ایسی بیوی کا انتخاب لالچ یا اسٹیٹس کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ سادگی، اخلاص و دوراندیشی کی بنا پر ہوتا ہے۔

اپنی بائیک میں پٹرول بھروانے کے بعد جب ذرا دور چل کر شرارت سے یکایک بریک لگایا تو پیچھے بیٹھی نائلہ کھسک کر مزید ہمارے نزدیک آ گئیں تو لگا خوشبوؤں کا سیلاب آیا ہو، پھر ہمارے کانوں میں ہوئی سرگوشی سے جھرنوں کا ترنم بج اٹھا: "ذرا دھیرے چلو جی۔"

تبھی پاس سے گزرتی اک نئی کار پر ہماری نظر پڑی جس کے پیچھے جسٹ میریڈ کا بورڈ لگا ہوا تھا دولہا آگے دیکھتا کار چلا رہا تھا اور دولہن بازو بیٹھی شیشے سے باہر گزرتے مناظر دیکھ رہی تھی اور ہمیں لگا کہ دونوں کے درمیان فاصلہ تھا۔

کڈپہ کی گم نام اُردو مصنفہ شمیم صاحبہ

ستار فیضی کڈپوی (آندھرا پردیش)

محترمہ شمیم صاحبہ ایک بہترین اردو کی مصنفہ ہیں۔ گم نامی کے اندھیروں میں رہ گئیں۔ گھریلو حالات و دوسری مصروفیات نے اجازت نہیں دی۔ میں ان قلم کاروں کو منظر عام پر لا کر ان کی تخلیقات کو عزت و شہرت بخشنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ جب تک ادب ہے، قلم کاروں کی تخلیقات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ریاست آندھرا پردیش علاقہ رایلسیما ضلع کڈپہ سے افسانہ نگار شمیم جی کا تعلق تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ آپ کے والد صاحب کو اُردو زبان و ادب سے لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ تمام بھائی بہن نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی۔ گھر میں ڈھیر ساری کتابیں رسائل و جرائد کا انبار تھا۔ اسی ماحول سے انہوں نے استفادہ کیا۔ 1995 سے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کا افسانوں کا پہلا مجموعہ ”درپن“ 2009 میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنو کی امداد سے شائع ہوا۔ 176 صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں کل 18 افسانے بعنوان یادیں، سزا، فیصلہ، دل کے رشتے، ٹھوکر، واپسی ممکن نہیں، وہ بات نہ رہی، انسانیت، آئیڈیل، خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں، وارث، احساس، پھر صبح ہوگی، تنہائی، مجھے جینے دو، معاف کر دیا، کیا کھویا کیا پایا، خودنوشت ہیں۔ افسانوں کے اس مجموعہ کو آپ نے اپنے والدین کے نام منسوب کیا۔

آپ نے شہر کڈپہ کی مقامی کالج سے ڈگری لی اور اعلیٰ تعلیم اردو میں ایم اے سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی سے سند حاصل کیں۔ شمیم صاحبہ نے نثری صنف افسانہ کا انتخاب کیا اپنی تحریروں کے لئے۔ اس کے علاوہ ادبی تنقیدی اور مذہبی مضامین بھی لکھ چکی ہیں۔ مصنفہ کی اردو خدمات قابل تعریف و تحسین ہیں۔

آپ حساس طبیعت کی مالک ہیں اور مشاہدہ کی نظر رکھتی ہیں۔ آپ کے کئی افسانہ ہندوستان کے معیاری کئی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ چند افسانوں کا تیلگو، کنڑی اور ہندی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اردو کے اہم خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی و قرۃ العین حیدر کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ آپ کے بعد نئی نسل میں ابھرتے ہوئے خواتین قلم کار جیسے ڈاکٹر شاذیہ بیگم، ڈاکٹر نجمہ النساء، مغل ریحانہ پروین، ملکہ بیگم، امیر النسا، فہمیدہ بیگم، سرتاج، مہر النسا، رقیب النساء عالیہ وغیرہ ادبی میدان میں موجود ہیں اور نمایاں اردو ادبی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

شمیم صاحبہ کو افسانے کی کشش نے گھیرا۔ آپ کے افسانوں میں زندگی کی سچائیاں موجود ہیں۔ ان کے کئی افسانوں کے کردار ہماری زندگی اور تجربوں سے مطابقت رکھتے ہیں، ان میں انسانی فطرت و نفسیات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

قلم قافلہ۔ادبی تعارف

خالد سیف اللہ موتیہاری

میں خالد سیف اللہ موتیہاری (فاضل، بی اے – مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) علمی و ادبی حلقوں میں ایک سرگرم نثر نگار، کالم نگار اور صحافی کی حیثیت سے وابستہ ہوں۔ تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ معتبر اخبار ”روزنامہ تاثیر“، پٹنہ (بہار) کے نمائندے کے طور پر بھی ذمہ داریاں نبھا رہا ہوں۔ میرا بنیادی ادبی میدان نثری نگارشات ہے، جس کے تحت معاشرتی موضوعات، اخلاقیات، سیرتِ پاک اور مختلف سماجی عنوانات پر مستقل قلم اٹھانے کی مخلصانہ کوشش جاری ہے۔ میری تصنیفی و تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں اس وقت پانچ کتابیں اشاعتی مراحل (زیرِ طبع) سے گزر رہی ہیں، جن میں ”سنہرے اخلاق“، ”وما ادراک“، ”خوشبوئے سیرت“، ”مکتوبِ بندگی“ اور ”ادھورے چہرے“ شامل ہیں۔ میرا تعلق موتیہاری، بہار (انڈیا) سے ہے۔

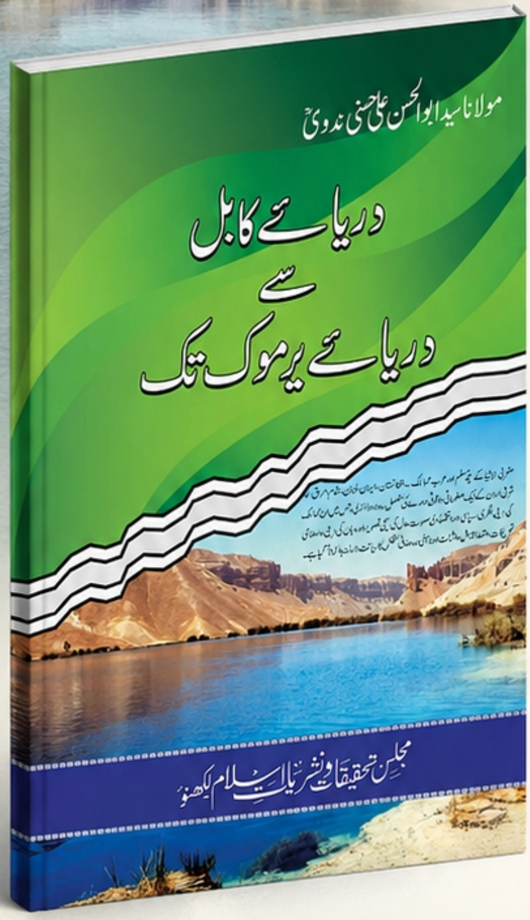

مولانا ابوالحسن علی ندوی

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ایک اہم سفرنامہ ہے، جو پہلی بار 1974ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں مصنف نے افغانستان، مشرقِ وسطیٰ اور متعدد عرب و مسلم ممالک کے اپنے اسفار، مشاہدات، علمی ملاقاتوں اور وہاں کے سیاسی، دینی اور تہذیبی حالات کو نہایت بصیرت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

کتاب کی نمایاں خصوصیات:

- افغانستان سے لے کر شام تک کے سفر کی روداد۔
- مسلم دنیا کے فکری، تعلیمی اور سماجی مسائل کا تجزیہ۔
- اسلامی تحریکات اور دینی اداروں کا تعارف۔
- مختلف ممالک کے علماء، دانشوروں اور قائدین سے ملاقاتوں کا ذکر۔
- مولانا ندوی کا مخصوص ادبی، شگفتہ اور فکر انگیز اسلوب۔

"یہ سفرنامہ محض سفری یادداشت نہیں بلکہ بیسویں صدی کی مسلم دنیا کی ایک فکری اور تہذیبی دستاویز بھی ہے، جس میں مصنف نے اپنے مشاہدات کے ذریعے امتِ مسلمہ کی حالت اور مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی ہے۔

آپ کے خطوط

(۱)

تحقیقی رجحان

ہائیکو پر ڈاکٹر گوہر مسعود صاحب کی تحریر نہایت مفید و معلوماتی ہے۔ کچھ تشنگی بھی محسوس ہوئی۔

"پاکستان میں اس صنف کو باقاعدہ ایک علمی و تنقیدی سطح پر روشناس کروانے میں رفیق سندیلوی کا نام نمایاں ہے، جنہوں نے "پاکستان میں اردو ہائیکو" کے عنوان سے ایک مستند کتاب لکھی۔" دیگر مشہور شعراء میں ادا جعفری (مجموعہ: سازِ سخن)، محمد بشیر سیفی، ماجد الباقری، اور اسلم راجا نے ہائیکو میں گہرے فلسفیانہ اور فطری موضوعات کامیابی سے پیش کیے ہیں۔

ہائیکو پر زیادہ لکھا نہیں گیا۔ آج کا اردوداں طبقہ اس صنف سے کچھ زیادہ واقف نہیں۔ اردو گلبن میں اسی موضوع پر پچھلے کسی شمارہ میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس سے رسالہ پندرہ روزہ گلبن کے تحقیقی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

انیس احمد صدیقی

ممبئی، مہاراشٹرا، ھندوستان

(۲)

خوب سے خوب تر

ماشاءاللہ ۔۔۔ خوب سے خوب تر۔ ہر شمارہ پہلے سے زیادہ دیدہ زیب، خوبصورت اور خوب سیرت، حالاتِ حاضرہ سے ہم آہنگ اداریہ، قرآنی آیات اور حدیثِ مبارکہ سے قارئین کے خطوط تک مربوط اور مرصع، ماہِ محرم الحرام کی مناسبت سے پُر اثر، بصیرت افروز منظوم و نثری شہ پاروں کے ساتھ ساتھ عید ملن مشاعرے کی رُوداد کیا کہنے، افسر بارہ بنکوی اور امرینہ قیصر کا کلام غالباً حسنِ تصادم کی نظر ہو گیا جبکہ فیصل طفیل اور دیگر کئی شعرائے کرام کے کلام سے محرومی کا احساس رہا۔

اللہ تعالیٰ آپ کی ادبی اور علمی خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازے آمین۔

اطہر عباسی

(صدر، عالمی اردو مرکز، جدہ، سعودی عرب)

(۳)

بہترین رسالہ

رسالہ اردو گلبن ماشاءاللہ بہت عمدہ اور بہترین ہے۔ ترتیب و ڈیزائن خوبصورت ہیں، تحریریں معیاری ہیں۔

ان کے روضہ پہ میری حاضری سبحان اللہ!
مجھ سے ذروں کو خدا لعل و گہر کرتے ہیں
سبحان اللہ العظیم

شکیل احمد

(سابق ڈپلومیٹ، دہلی)

(۴)

قابلِ تعریف کاوش

اُردو کے لیے آپ کی کاوشیں قابل تعریف ہیں، خاص طور پر ایسے وقت میں جب ہمیں اُردو کو دوبارہ زندہ کرنے اور اس کا قد واپس کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

پروفیسر ندیم زبیری
میڈیکل کالج، کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی،
رابغ، سعودی عرب

(۵)

عزت افزائی

میں مجلسِ ادارت و انتظامیہ اردو گلبن، جدہ کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری معمولی ادبی کاوشوں کو اس قدر محبت، عزت اور حوصلہ افزائی سے نوازا۔ یہ سپاس نامہ میرے لیے باعثِ اعزاز اور مزید ذمہ داری کا احساس ہے۔ دعا ہے کہ اردو گلبن اسی طرح علم و ادب کی خدمت کرتا رہے۔ ان شاء اللہ، آئندہ بھی اپنی بساط کے مطابق خلوصِ نیت کے ساتھ قلمی تعاون جاری رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں زبان و ادب کے لیے نافع بنائے۔ آمین۔

سلیم خان
ہیوسٹن (ٹیکساس) امریکا

(۶)

ادب-ایک تہذیب وامانت

آپ کا محبت، اخلاص اور قدر شناسی سے معمور سپاس نامہ موصول ہوا۔ یقین جانیے، اسے پڑھتے ہوئے دل تشکر، انکسار اور مسرت کے ایسے احساسات سے معمور ہوا جن کی ترجمانی کے لیے موزوں الفاظ بھی اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرنے لگے۔ اہلِ علم و ادب کی جانب سے کسی معمولی سی قلمی کاوش کو اس حسنِ نظر، فراخ دلی اور محبت کے ساتھ قبولیت ملنا کسی بھی اہلِ قلم کے لیے نہ صرف باعثِ افتخار بلکہ آئندہ سفر کے لیے حوصلہ، اعتماد اور نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

میری تحریروں کو جس عزت، محبت اور اعتماد کے ساتھ آپ نے سراہا، میں اسے اپنی ذات کی پذیرائی سے کہیں بڑھ کر اُردو ادب کی اس روشن روایت کا تسلسل سمجھتی ہوں جس نے ہمیشہ اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی کو علم و ادب کی خدمت کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قلم کو وقار اسی وقت نصیب ہوتا ہے جب صاحبانِ ذوق کی قدر شناسی، اہلِ علم کی دعائیں اور ادب نواز دوستوں کی پذیرائی شامل ہو۔ آپ کے اس مخلصانہ التفات نے احساسِ ذمہ داری کو مزید بڑھا دیا ہے کیونکہ میرے نزدیک ادب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ تہذیب، فکر، احساس اور انسانی اقدار کی ایک عظیم امانت ہے۔ یہی امانت ہر دور میں اہلِ قلم کو اس امر کی دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنی بساط بھر سچائی، خیر اور حسن کے چراغ روشن رکھیں۔

اگر میری یہ مختصر سی علمی و قلمی کاوش اس روشن روایت کے تسلسل میں کسی درجے پر بھی معاون ثابت ہو تو میں اسے اپنی خوش نصیبی، سعادت اور فضلِ الٰہی سمجھوں گی۔

میری دلی دعا ہے کہ "اردو گلبن" اپنی اسی متوازن فکری روش، علمی وقار اور ادبی ذوق کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کا یہ مبارک فریضہ ہمیشہ انجام دے، اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی کرے، نئی نسل میں مطالعے، تحقیق اور تخلیقی شعور کو فروغ دے اور دنیا بھر میں بسنے والے اردو زبان و ادب کے شیدائیوں کے درمیان محبت، علم اور تہذیبی رشتوں کو مزید استحکام بخشے۔ ایسی ادبی انجمنیں دراصل زبانوں کی بقا، تہذیبوں کے تسلسل اور فکری ورثے کے تحفظ کی ضامن ہوتی ہیں اسی لیے ان کی خدمات ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر آپ سب کی محبت، عنایات اور عزت افزائی پر بصمیمِ قلب ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس مخلصانہ ادبی خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشے، آپ کی کاوشوں کو خیر و برکت، وسعت اور دوام نصیب ہو، اس بزمِ ادب کو روز افزوں ترقی، مقبولیت اور استحکام سے نوازے اور ہم سب کو اخلاص، دیانت، استقامت اور حسنِ نیت کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثُمّ آمین یَا رَبَّ العَالَمِین

یاسمین اختر طوبیٰ،
ریسرچ اسکالر۔ گوجرنوالہ، پاکستان